POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 August 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 16-08-2026 • Price: 5/- • 22-28 August 2026 • Issue: 32 • Vol:85

۲۲تا۲۸/اگست ۲۰۲۶ء • شمارہ:۳۲ • جلد:۸۵

اُردو ادب کا ایک گمشدہ سفرنامہ نگار

ڈاکٹر عرفان شاہ

سنہ 60 کی دہائی میں ریڈرز ڈائجسٹ میں دو سیاحوں کا ذکر چھپا کہ وہ صرف 10 اسٹرالنگ پونڈ میں پوری دنیا کی سیاحت پر نکل چکے ہیں۔ انھی دنوں شہر کراچی میں ایک نوجوان جو شکل و شباہت سے دیکھنے میں کسی خوبرو ہیرو سے کم نہیں تھا اتفاقاً گھومتے پھرتے صدر میں واقع ’کیفے جارج‘ جا پہنچا۔ اچانک اس کی نظر اپنی دائیں طرف کی میز پر بیٹھے ہوئے دو غیر ملکی افراد پر پڑی جو اپنی تراش خراش اور حلیے سے پیدل سفر کے مسافر لگ رہے تھے۔ نوجوان کی حس متجسس پھڑکی، فوراً اُٹھا اور ان غیر سیاحوں سے مخاطب ہوا کیا آپ وہی سیاح ہیں جن کے بارے میں ریڈرز ڈائجسٹ میں یہ شائع ہوا ہے کہ صرف 10 اسٹرالنگ پونڈ میں آپ لوگ دنیا گھومنے نکلے ہیں۔ دونوں سیاحوں نے غور سے نوجوان کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پوشیدہ جوش کو پڑھتے ہوئے کہا: ہاں! اور یہ ناممکن نہیں اور اس وقت ہمارے پاس صرف 6 پونڈ باقی ہیں۔ نوجوان فوراً کرسی پر بیٹھ گیا، اُردو اور انگریزی میں ملی جلی گفتگو اپنے نشیب و فراز طے کرتی رہی کیوں کہ نوجوان کو انگریزی پر دسترس نہ تھی اور سیاحوں کو اُردو پر۔ بہر حال دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے میں کامیاب رہے۔ سیاحوں سے ملاقات کے اختتام تک نوجوان مصمم ارادہ کر چکا تھا، وہ بھی ایک مہم جو کی طرح عالمی سطح پر پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کو سربلند کرے گا۔ کیفے جارج سے نکل کر نوجوان نے گہری سانس لیتے ہوئے آسمان کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تیری لامتناہی سرحدوں کی طرح میرے جذبے بھی بیکراں ہیں اور اس وقت دنیا دنگ رہ گئی کہ جب صرف 70 روپے میں اس نوجوان نے 47 ملکوں کی سیاحت کی۔ 1960 کے اواخر میں کراچی کی بندرگاہ پر ’اباسین‘ (یہ پاکستان کا پہلا کارگو بحری جہاز بھی تھا) لنگر انداز ہوا تو دمکتے چہرے والا یہ نوجوان سیّد وجاہت علی (پ: 22 اکتوبر 1940، م: 25 مئی 2024) فاتحانہ انداز میں عرشے پر نمودار ہوا۔ اس کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد والہانہ استقبال کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے تھی۔ ظہور الحسن بھوپالی شہید آگے بڑھے اور شہریوں کی جانب سے ہار پہنا کر سیّد صاحب کو خوش آمدید کہا۔ سیّد وجاہت علی صرف سیاح ہی نہیں بلکہ ایک ایسے قلم کار تھے جنھوں نے اُردو سفرنامے کو نئی جہتیں دیں۔ انھوں نے بیشتر ایسے سفرنامہ نگاروں کی حقیقت سے قارئین کو روشناس کرایا جنھوں نے تخیل کے زور اور معلومات کی بنیاد پر سیاحت کیے بغیر ہی سفرنامے لکھ کر ادبی بددیانتی کی۔

سیّد صاحب وہ پہلے پاکستانی سیاح و قلم کار تھے جن کے ٹی وی/ریڈیو ایران پر انٹرویو نشر اور ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ اُس وقت یہ دونوں ابلاغی ادارے اپنے ابتدائی مراحل میں تھے۔ ریڈیو پاکستان سے ایس ایم سلیم نے ان کے فن و شخصیت پر تفصیلی پروگرام کیا۔ سیّد صاحب پر طباعتی ذرائع ابلاغ میں پہلا اجمالی مضمون راقم الحروف نے ماہنامہ ’فرنٹ اسٹار‘ کراچی کے شمارہ جون 1993 میں شائع کیا۔ ان کے سفرناموں کو بیرون ملک جرائد ’رانشے پوسٹ‘ جرمنی، ’تہران جنرل‘ ایران اور ’جریدۃ العرب‘ عراق نے نمایاں طور پر شائع کیا۔

ان کا سفرنامہ ’میں نے لینن کا روس دیکھا‘ کا تیرہ غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اسے حکومتِ روس نے سرکاری طور پر شائع کیا۔ انھوں نے روس کے متعلق اس وقت غیر جانبدارانہ لکھا جب اس کا نام لینا بھی پاکستان میں کفر تھا۔ ملک میں یہ پہلی کتاب تھی جو روس کے حوالے سے شائع ہوئی۔ اس میں سیّد صاحب نے جس طرح تاریخ کے تغیر کو قارئین کے سامنے پیش کیا، اس نے یہ سچ ثابت کر دیا کہ اسلام ہی آفاقی دین ہے اور دیکھ لیجیے آج وسط ایشیائی آزاد ریاستوں میں زیادہ تر اسلامی ہیں۔ سیّد صاحب صرف واقعات کے راوی نہیں بلکہ مشاہدے اور تجزیے کی بنیاد پر خیال قرطاس ابیض پر بکھیرتے ہیں۔ یہ بھی ہمارے ملک کا دہرا نظام ہے کہ ایک طرف سیّد وجاہت علی کو روس کی پچاسویں سالگرہ میں شرکت سے روک دیا جاتا ہے اور دوسری جانب فیض احمد فیض کو لینن ایوارڈ ملنے پر معتبر جانا جاتا ہے، لیکن اصل ایوارڈ ایک تخلیق کار کے لیے عوامی پذیرائی ہے اور اس اعتبار سے سیّد صاحب شہنشاہ ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ’بادشاہ گر‘ تھے۔ آج ہمارے طباعتی و برقی ذرائع ابلاغ اور فنونِ لطیفہ کے کئی ممتاز ستارے ایسے ہیں جنھیں تراش کر سیّد وجاہت علی نے ہیرا بنایا۔ اب اگر یہ افراد اعلاظرفی کا دامن چھوڑتے ہوئے اپنے محسن کو فراموش کر دیں تو کیا کہا جا سکتا ہے مگر گواہی کے لیے ابھی کچھ لوگ باقی ہیں۔ لیکن ’جان‘ (سیّد صاحب اپنے خانوادے اور قریبی احباب میں اسی عرفیت سے معروف تھے) بڑے انسان تھے۔ نیکی کر کے بھول جانا اور احسان کر کے نہ جتانا ان کی فطرت تھی۔

اُردو سفرناموں میں سیّد صاحب کی جو اہمیت ہے وہ معاصرین کے اعتراف سے مستند ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں محسن بھوپالی لکھتے ہیں:

> ’’یہ دیکھ کر طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ وجاہت علی نے سفرناموں کے عالمی معیار کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی تحریر میں ایک تسلسل ہے، روانی ہے، بہاؤ ہے، ایک ایسے دریا کا بہاؤ جو اپنے کنارے خود کاٹتا ہے اور اپنی منزل کا تعین خود کرتا ہے۔ وجاہت اپنے سفرنامے میں زندگی کی گہما گہمی، رنگارنگی، سرمستی اور آسودگی کا ذکر بھی اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان کی تہوں میں دبے ہوئے انسانی دکھوں، معاشرتی ناسوروں اور تاریخی المیوں کا تاثر تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا اجنبی راستوں اور بھول بھلیوں سے گزر کر ایک ایسی شاہراہ پر آ جاتا ہے جو عالمگیر انسانیت اور بھائی چارے کی شاہراہ ہے۔‘‘[۱]

منفرد ادیب، نقاد، صحافی اور شاعر احمد ندیم قاسمی کے نزدیک:

> ’’ایک سیاح کے قدم تو آگے بڑھتے رہتے ہیں اور آنکھیں دیکھتی بھی رہتی ہیں لیکن سیاح جب وجاہت علی ہوں تو قدموں اور آنکھوں کے ساتھ اس کا ذہن بھی سفر کرتا ہے، ایک ایسا سفر جس کی منزل ایک قابلِ قدر کتاب بن جاتی ہے۔‘‘[۲]

ممتاز کالم نگار، ناول نگار افسانہ نگار، صحافی و ادیب ابراہیم جلیس نے سیّد وجاہت علی کے بارے میں لکھا:

> ’’سیّد وجاہت علی ایک زیادہ کامیاب قلم کار ہیں یا زیادہ بامراد مسافر یا پھر دونوں؟ اوّل تو دنیا کو دیکھنا اور سمجھنا ہی مشکل ہے چہ جائیکہ دنیا کو اس کی پوری رعنائیوں کے ساتھ بیان کرنا، لیکن سیّد وجاہت علی نے دونوں مشکلیں آسان

قارئین! اب ’ہماری زبان‘ کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

کردیں ہیں۔"[3]

معروف ڈراما نگار اور کہانی نویس میرزا ادیب نے اعتراف کیا اور لکھا:

"سیّد وجاہت علی نے لمحوں سے سالوں کا رس نچوڑا ہے۔
اور اتنی سی عمر میں اتنے خوبصورت افسانے لکھیں ہیں کہ اردو
ادب کو ایک نیا سرمایہ میسر ہوا ہے۔"[4]

ان صاحب الرائے ممتاز قلم کاروں اور ناقدین کے علاوہ مشفق خواجہ جیسے انتہائی کثیر المطالعہ وغیر جانبدار نقاد نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مضمون 'اُردو ادب کے دس سال' میں تفصیلی طور پر سیّد صاحب کے سفرناموں کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ گلوب کے گرد چکر لگاتے ہوئے جہاں سیّد صاحب نے کئی رنگ دیکھے وہاں ان کے دل ناداں نے کئی چوٹیں بھی کھائیں لیکن گھائل صرف جرمن دوشیزہ اینڈریا نے کیا جس کے پیار میں سیّد صاحب نے چھے دفعہ جرمنی کا سفر کیا۔ ان دونوں کی محبت سچے جذبوں سے عبارت تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ آج بھی اینڈریا کے خاندانی پیانو پر، سیّد صاحب کی تصویر جرمن روایت کے مطابق موم بتیوں اور پھولوں کے درمیان سجی ہے۔ سیّد صاحب کی سچائی یہ ہے کہ انھوں نے بھی بلاتردد اس کے پیار کا اعتراف اپنے دل کی دھڑکن قرار دیتے ہوئے کیا ہے۔ سیّد صاحب کے بڑے صاحبزادے اور صحافی سیّد کامران وجاہت نے اس ضمن میں بتایا کہ یہ دلچسپ واقعہ ریکارڈ پر موجود ہے کہ صدر مملکت محمد ایوب خان جب پیرس گئے تو ہوٹل میں سیّد صاحب کی بھی ان سے ملاقات ہوئی، اس موقعے پر صدرِ پاکستان نے مسکراتے ہوئے کہا:

'تم وہی اینڈریا والے علی ہو'

اس واقعے کو جرمن اخبارات نے شہ سرخیوں سے شائع کیا۔ یہ امر بھی اہم ہے کہ اس وقت جرمنی میں خال خال ہی کوئی پاکستانی نظر آتا تھا۔ اگر اس موقعے پر یہ کہا جائے کہ "جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے" تو سیّد صاحب کے لیے برمحل ہوگا۔ اس وقت کے وزیر اعظم عراق کریم ابوالقاسم کی بھتیجی 'فوزیہ'، ترکی کے مشہور تاجر نصیر کمال کی بیٹی 'آشا'، آسٹریلیا میں 'مس جینٹ' اور بینکاک میں 'تانیا' وہ پری وش تھیں جنھوں نے سیّد صاحب کے سفرِ عشق کو دوآتشہ کیا لیکن ان تمام حوادث کے باوجود 'اینڈریا' کی یاد تا دمِ مرگ سیّد صاحب کے ساتھ رہی۔ وطن کی بے پناہ محبت 'اینڈریا' پر غالب آئی اور سیّد صاحب واپس لوٹ آئے۔

پاکستان آنے کے بعد 1967 کی دہائی میں انھوں نے بحیثیت کالم نگار اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اُس وقت کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ 'انجام' کراچی میں 'سیرِ جہاں 70 روپے میں' کے زیرِ عنوان لکھنا شروع کیا۔ اُس وقت اخبار کے مدیر مشہور ناول نگار شوکت صدیقی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا کالم زبان زد عام ہوگیا۔ ایک ایسے وقت میں جب ہم عصروں میں قتیل شفائی، اطہر نفیس، ارشاد راؤ، احمد فراز، منہاج برنا، سردار علی صابری، محمودہ سلطانہ، ابن انشا، ابراہیم جلیس، پیر علی محمد راشدی، سیّد ہاشم رضا، مجیب الرحمٰن شامی، رئیس احمد جعفری، شاہد احمد دہلوی، رئیس امروہوی، انعام درانی، نصر اللہ خان اور محمود شام شامل ہوں، اپنے لکھے کو منوانا ایک سچے تخلیق کار کا ہی کمال فن ہوسکتا ہے۔ سیّد صاحب اس بات کا اعتراف بڑے احترام سے کرتے تھے کہ انھوں نے صحافت میں جو کچھ سیکھا وہ بانی روزنامہ 'جنگ' میر خلیل الرحمٰن سے سیکھا۔

روزنامہ 'انجام' کراچی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ روزناموں میں سب سے پہلے ہفتہ وار 'سفرنامہ' اسی اخبار میں شائع ہوا جو سیّد صاحب نے لکھا۔ روزنامہ 'انجام' کراچی کے بعد ہفت روزہ 'اخبارِ جہاں' میں محمود شام کی تجویز پر انھوں نے اپنے کالم کا عنوان 'سیرِ جہاں' رکھا۔ جب تک یہ کالم چھپا قارئین اس کے سحر میں گرفتار رہے۔ اسی دوران میر خلیل الرحمٰن نے 'جنگ' کوئٹہ کا آغاز کیا تو ان کی مردم شناس نظر نے سیّد صاحب کا انتخاب کیا اور انھیں 'جنگ' کوئٹہ کی ذمے داریاں تفویض کردی گئیں۔ انھوں نے صوبہ بلوچستان میں اُردو صحافت اور بالخصوص 'جنگ' اخبار کی ترقی و ترویج کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ایک الگ داستان ہے۔ اسی دوران گورنر بلوچستان خان آف قلات احمد یار خان نے انھیں اپنا ذاتی مشیر نامزد کیا، لیکن سیّد صاحب نے اپنی قلندرانہ صفات کے باعث اس کو قبول نہیں کیا۔ 'جنگ' کوئٹہ سے سیّد صاحب واپس کراچی آئے تو ملازمت سے ان کا دل اپنی آزادانہ فطرت کے باعث اُکتا چکا تھا اور انھوں نے اپنے ماہوار پرچے 'صورت' کراچی کی اشاعت شروع کی اور بعدازاں 1988 میں اس کو روزنامہ 'صورت' میں تبدیل کردیا۔ شام کے شائع ہونے والے اخبارات میں 'صورت' کو ممتاز مقام حاصل رہا۔ خاص کر سیّد صاحب کا کالم 'دیکھ کبیرا رویا' نے قارئین کو اپنی گرفت میں رکھا۔

ماہنامہ 'صورت' اپنے مزاج اور مواد کے اعتبار سے ہمیشہ اپنے ہم عصر رسائل میں منفرد رہا۔ ماہنامہ 'صورت' میں 'پھولن دیوی' کی سوانح کی اشاعت نے پاک و ہند میں وہ تہلکہ مچایا جس نے 'پھولن دیوی' کو کامیاب سیاست داں بنادیا۔ یہ حقیقت ہے کہ سیّد وجاہت علی اگر سیاح اور صحافی نہ ہوتے تو مقبول فلم اسٹار ہوتے۔ سیّد صاحب نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ وہ حقیقتاً فلم اسٹار ہی بننا چاہتے تھے لیکن حالات نے قلم کار بنادیا پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید اللہ نے مجھے اسی لیے پیدا کیا ہے، اسی لیے جب شباب کیرانوی اور قتیل شفائی میرے پاس آئے اور فلم کی پیشکش کی تو میں نے انھیں کہا "میں قلم کی طاقت کو چھوڑ کر فلم جیسی کمزور چیز کو نہیں اپنا سکتا۔"[5]

سیّد وجاہت علی ساحر تھا جو اپنی گفتگو اور قلم سے دشمن کو بھی دوست بنالیتا تھا، اسی پس منظر میں ان کا کالم 'دیکھ کبیرا رویا' جو روزنامہ 'صورت' کی شناخت تھا۔ اگر اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ان کی شخصیت میں پوشیدہ درویش واضح ہوکر سامنے آتا ہے، جس طرح کبیرا مظلوم کی حمایت کا علمبردار ہے اسی طرح صحافت میں سیّد صاحب سچائی اور بے باکی کی علامت تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اُصولوں پر زندگی گزاری یہی وجہ تھی کہ مراعات یافتہ طبقے میں مواقع ہوتے ہوئے بھی شامل نہیں ہوسکے۔

شاید اسی وجہ سے ازدواجی زندگی مسائل کا شکار رہی۔ سیّد صاحب اکثر کہا کرتے تھے: "ہمارے ملک میں صحافت ابھی تک مصلحتوں کی گود میں بیٹھی ہے۔" آج یہ بات سچ ہوچکی ہے۔

روزنامہ 'صورت' میں سیّد وجاہت کی جو قربت اعتماد اور تربیت مجھے حاصل ہوئی وہ میری عملی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اخبار میں مجھے دو اچھے دوست سیّد صاحب کے صاحبزادے معروف صحافی سیّد کامران وجاہت اور داماد ناصر الدین محمود ملے جن کی رفاقت کی سنہری یادیں تازہ ہیں۔ ناصر الدین محمود کے سعادت مند صاحبزادے اور سیّد صاحب کے نواسے زین ناصر ممتاز بینکر اور انتہائی خوش اخلاق ہیں۔

راقم الحروف کو یقین ہے کہ اُردو ادب کے ناقدین سیّد صاحب کے سفرناموں کو عام قارئین سے روشناس کرانے میں اپنا حق ادا کریں گے اور اعلا سطحی تحقیقی کام کرنے والے محققین بھی اس نابغۂ سفرنامہ نگار کی بازیافت میں اپنا کردار ادا کریں گے۔[6]

سیّد وجاہت علی کے سفرنامے

1- اور زندہ لوٹ آئے۔
2- جب میں نے انقلاب پسندوں کا عراق دیکھا۔
3- جب میں نے کمال کا ترکی دیکھا۔
4- جب میں نے شاہ کا ایران دیکھا۔
5- جب میں نے لینن کا روس دیکھا۔
6- جب میں نے کویت دیکھا۔
7- صحرا میں سونا ابوظہبی۔
8- مشرق مغرب کی بانہوں میں۔
9- آؤ! دیوارِ برلن گرائیں۔
10- دیس دیس کی عورتیں۔
11- جب میں نے تانیا کا بنکاک دیکھا۔

دیگر تصانیف و تالیفات

1- نیا دور نیا خون (مزدور لیڈروں پر ملک میں پہلی کتاب)
2- بلوچستان پیاسا ہے (اس کے اقتباس ہفت روزہ 'الفتح' کراچی میں بھی شائع ہوئے)
3- لندن کی سڑکیں سونے کی ہیں (بچوں کے لیے)
4- ناصر سے بھٹو تک (یہ کتاب دنیا کی اہم انقلابی شخصیات انور السادات، یاسر عرفات، اندرا گاندھی، جمال عبدالناصر، کرنل محمد قذافی اور ذوالفقار علی بھٹو کے انٹرویوز پر مشتمل ہے جو سیّد صاحب نے ویژن نیوز لندن سے وابستہ محسن برنی کے ساتھ کیے تھے)۔

حواشی:

[1] سیّد وجاہت علی: 'جب میں نے شاہ کا ایران دیکھا'، ایجوکیشنل پریس کراچی، 1970، ص9۔

[2] سیّد وجاہت علی: 'جب میں نے لینن کا روس دیکھا'، ایجوکیشنل پریس کراچی-س/ن، ص8۔

[3] سیّد وجاہت علی: 'اور زندہ لوٹ آئے'، ایجوکیشنل پریس کراچی، 1978، ص5۔

[4] سیّد وجاہت علی: 'صحرا میں سونا، ابوظہبی' احباب پبلی کیشن، کراچی، س/ن، ص12۔

[5] راقم الحروف کو سیّد صاحب کے واقعات کے ضمن میں ان کی صاحبزادے سیّد کامران وجاہت نے اپنے آبائی گھر یوسف پلازہ، بلاک 15، ایف بی ایریا، کراچی کے یونین آفس میں بتایا تھا۔

[6] بیشتر مواد مملوکہ سیّد صاحب کے بڑے صاحبزادے صحافی سیّد کامران وجاہت نے فراہم کیا۔ مزید تحقیقی کام کرنے والے ان سے اس نمبر 0333-3497690 پر رابطہ کرسکتے ہیں۔

سابق صدر شعبۂ اُردو، سراج الدولہ گورنمنٹ ڈگری کالج نمبر ا، ایف سی ایریا، کراچی
urduduniya92@gmail.com, Mob. 333-2125510

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین و مقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-

قسط نمبر:5

مسائلِ لغت وقواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

ڈاکٹر ابراہیم افسر

گذشتہ سے پیوستہ

مشفق خواجہ کے نام 25 اگست 2000 کو لکھے مکتوب میں رشید حسن خاں نے کلیاتِ یگانہ میں شامل فرہنگ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔کلیاتِ یگانہ کو مشفق خواجہ نے جنوری 2003 میں شائع کیا تھا۔اس کلیات میں فرہنگ کا التزام کیا گیا تا کہ دورِ حاضر کا قاری اُن الفاظ سے روشناس ہو سکے جن سے اُس کی واقفیت کم ہے۔اس سے قبل مشفق خواجہ 10 اگست 2000 کو رشید صاحب کو فرہنگِ یگانہ کے متعلق خط تحریر کر چکے تھے۔انھوں نے اس بات کا اعتراف صدق دل سے کیا کہ وہ خاں صاحب کی فرہنگوں اور مقدموں سے فرہنگِ یگانہ کے لیے استفادہ کر رہے ہیں۔اس بارے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''آج کل میں کلیاتِ یگانہ کی فرہنگ بنا رہا ہوں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ فرہنگ کو کسی لفظ میں [فرہنگ میں کسی لفظ کو] شامل کرنے کا معیار کیا ہو، یہ مسئلہ آپ کی مرتّبہ کتابوں کی فرہنگیں دیکھ کر حل ہو گیا کہ ہر طرح کے الفاظ فرہنگ میں شامل ہونے چاہئیں کیوں کہ فرہنگ کسی مخصوص ذہنی سطح کے لوگوں کے لیے نہیں ہونی چاہیے، ہر سطح کا آدمی پیشِ نظر رہنا چاہیے۔اب ایک اور مسئلہ میرے سامنے ہے اور وہ یہ کہ کلاسکی متن کے ساتھ فرہنگ تو بہرحال ضروری ہے، لیکن ہم عصر شعرا کا کلام مرتّب کیا جائے تو اس کے ساتھ فرہنگ کی کیا ضرورت ہے کیوں کہ معاصرین ہم سے الگ زبان استعمال نہیں کرتے۔ میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب شاعر یگانہ جیسا ہو جس نے حریفوں پر لسانی برتری حاصل کرنے کے لیے خاص خاص محاورے اور الفاظ عمداً اِستعمال کیے ہوں تو اُس کے کلام کے ساتھ فرہنگ کا ہونا ضروری ہے۔یگانہ اکثر ایسے خوابیدہ الفاظ اور محاورے استعمال کرتا ہے جو اُس کے معاصرین نہیں کرتے۔ اِس سلسلے میں آپ میری رہنمائی فرمایئے۔فرہنگوں کو دیکھتے دیکھتے میں نے آپ کی کتابوں کے مقدمے دوبارہ پڑھ ڈالے اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ ان مقدموں کو گاہے گاہے پڑھتے رہنا چاہیے تا کہ بہت سے اہم مباحث ذہن نشیں ہو جائیں''۔[44]

رشید صاحب نے اس خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

''فرہنگِ یگانہ کا معاملہ کلاسکی متون کی فرہنگوں سے بالیقین مختلف ہے۔اس میں اگر زیادہ لفظ درج کیے گئے تو بدنما لگیں گے اور یہ غیر ضروری بھی ہوگا۔صرف وہ الفاظ یا کلمات درج کیجیے جو معنوی طور پر کوئی خاص اہمیت یا پہلوداری رکھتے ہوں۔ میں ایک مثال سے یہ بات واضح کروں: ع: نکلتے پیٹھتے دن تھے، بہار آنے کا ساماں تھا۔اس میں نکلتے پیٹھتے دن تداخلِ فصلین کے لیے آیا ہے اور اِس کی وضاحت خود یگانہ نے کی ہے۔اِسے لازماً درجِ فرہنگ ہونا چاہیے۔ہاں بعض الفاظ فرہنگ میں درج کیے جائیں گے مگر ذرا سی وضاحت کے ساتھ۔بس ایک مثال یگانہ نے ایک نہایت عمدہ غزل لکھی ہے، جس کی ردیف 'ہیں کیا کیا' ہے، جس میں وہ اعلا درجے کا شعر بھی ہے۔دوسرا مصرع یہ ہے: 'بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا'۔اس کا مقطع ہے:

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں، کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

ذات ایک تو وجود کے معنی میں آتا ہے اور یہ جات کی بدلی ہوئی شکل بھی ہے (ذات پہچانی گئی وغیرہ)۔اساتذہ ایسے الفاظ کے استعمال میں بہت احتیاط کرتے تھے جن میں اس انداز کا ذومعنی پن ہو اور ایک معنی میں کسی طرح سے ذم کا پہلو پیدا ہو سکے۔ یہاں بھی یہی ہوا ہے۔حریفوں نے شاید دیکھا نہیں اسے، ورنہ شور مچاتے کہ یگانہ کو اپنی ذات میں خود شک تھا، بدقومے ہیں۔یگانہ کی آنکھ یہاں جھپک گئی۔اس طرح کہنا نہیں چاہیے تھا؛ تو یہ لفظ 'ذات' فرہنگ میں ذومعنی پن کے حوالے کے ساتھ آئے گا، ویسے 'ذات' بہ جائے خود شاملِ فرہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو میں نے خوامخواہ لکھ دیا، کیوں کہ آپ کو فرہنگ سے متعلق کچھ بتانا، ارسطو کو منطق پڑھانا ہے''۔[45]

مشفق خواجہ نے اپنے کئی خطوط میں کلیاتِ یگانہ کی فرہنگ کے تصحیح شدہ متن پر عمل کرنے کی بات لکھی ہے۔جب خواجہ صاحب نے اس فرہنگ کو تیار کر لیا تو رشید صاحب کی خدمت میں اسے ارسال کیا۔اس بابت وہ لکھتے ہیں:

''کلیاتِ یگانہ کی فرہنگ میں نے تیار کر لی ہے۔یہ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ اِسے بہ نظرِ اصلاح دیکھ لیجے۔ بعض لفظوں یا محاورات کے معنی میں متعین نہیں کر سکا۔اُن کو بہ طورِ خاص ملاحظہ فرمایئے۔اُن پر سرخ نشان لگا دیا ہے۔ فرہنگ کی ترتیب لغت کے مطابق نہیں ہے۔ یہ میں بعد میں درست کر لوں گا۔الفاظ میں نے بہت کم کر دیے ہیں، لیکن اب بھی اگر بعض الفاظ خارج کرنے کے لائق ہوں تو خارج کر دیجیے۔آپ کی نظر سے گزرنے کے بعد مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ یہ فرہنگ اشاعت کے لائق ہے''۔[46]

رشید حسن خاں نے خطوط کے علاوہ اپنے انٹرویوز میں بھی املا، لغت اور زبان وقواعد کے تعلق سے بہت ہی کارآمد باتیں کی ہیں۔ انھوں نے بارہا اس بات کا اعتراف کیا کہ اُردو ہندستانی زبان ہے۔وہ اسی سرزمین میں پروان چڑھی۔اس کا اپنا رسمِ خط ہے۔اور یہی رسمِ خط اس کی روح ہے۔رشید صاحب کسی بھی زبان کے رسمِ خط کو بدلنے کے منکر تھے۔ان کی نظر میں زبانوں کے رسمِ خط بدلنے سے زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں۔البتہ وہ املا کی اصلاح کے قائل تھے۔انھوں نے اپنی تحریروں اور خطبوں میں اس بات کی وضاحت کی کہ رسمِ خط کے بجائے املا میں اصلاح کی جانی چاہیے۔انھوں نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں اس بات پر زور دیا کہ نصابی کتابوں میں املا یکساں ہونا چاہیے۔ طالبِ علم جس املا کی پیروی کرے گا وہ تاعمر اس پر عمل پیرا ہو جائے گا۔انھوں نے املا کے مسائل پر 1960 سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔املا کمیٹی کی سفارشات کو انھوں نے 'اُردو املا' کتاب میں شامل کیا۔ اسی طرح 'زبان وقواعد' میں لغت اور شاعری پر باتیں شامل کیں۔یعنی رشید صاحب کا ذہن ابتدا سے ہی املا، زبان اور لغت کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔شبنم رومانی کو دیے انٹرویو میں انھوں نے خود کہا:

''میری جو سب سے زیادہ محنت طلب کتاب ہے وہ 'اُردو املا' ہے، جس پر میں نے 1960 کے اوائل میں کام کرنا شروع کیا تھا اور 1972 میں 12 سال مسلسل کاوش کے بعد اس کام کو مکمل کر سکا، یہ کتاب 1974 میں شائع ہوئی۔ املا کے بعد قدرتی طور پر ذہن کو تلفظ کی طرف منتقل ہونا چاہیے تھا۔ مطلب یہ کہ وہ لفظ جس میں استعمال عام کی سطح پر کافی تغیر ہو چکا ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے لغت کے لیے قابلِ قبول ہونا چاہیے۔لیکن لغات میں ان الفاظ کا اندراج اس طرح نہیں ہوتا۔ میرے جو مضمون اس موضوع سے متعلق تھے، وہ میں نے 'زبان وقواعد' کے نام سے ایک کتاب میں مرتب کیے جسے ترقی اُردو بورڈ نے چھاپا''۔[47]

پاکستانی اسفار کے دوران رشید صاحب نے جو انٹرویو دیے، ان میں زیادہ تر سوالات املا، لغت وقواعد کے تعلق سے تھے۔ایسے ہی ایک انٹرویو میں جب اکرام چغتائی نے ان سے املا، لغت اور املا کمیٹی کی سفارشات کے تعلق سے سوال معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ اُردو میں ابھی تک جدید اصولوں پر کوئی لغت تیار نہیں کیا گیا جس وجہ سے اُردو الفاظ کے معانی کا تعین تو ہوتا ہے لیکن املا کا تعین نہیں ہوتا۔رشید صاحب اس سلسلے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ایک کتاب کی چار جلدوں کو چار الگ الگ کاتبوں نے لکھا تو ہر جلد کا املا جدا ہوگا۔وہ انگریزی لغات کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے یہاں املا، متن اور معانی میں یکسانیت موجود ہے، اس کے برعکس اُردو لغات میں استعمال اور معانی کا تعین میں یکسانیت ہوگی لیکن املا میں نمایاں فرق موجود رہتا ہے۔وہ انجمن ترقی اُردو کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ سب سے پہلے اس نے املا کے ضابطے پر توجہ مبذول کی۔انھوں نے اپنے جواب میں بار بار اس بات کو دہرایا کہ رسمِ خط کو بدلنے کے بجائے املا میں اصلاح کی جائے۔انھوں نے اس انٹرویو میں املا، قواعد ولغت پر کام کرنے کے محرکات پر بھی تبادلۂ خیال پیش کیا۔اس طویل جواب سے ایک مختصر لیکن جامع اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں مذکورہ باتوں کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے:

''اب دیکھیے کہ لغت میں لفظ درج ہوتے ہیں۔حروف تہجی کی نسبت سے۔مثال کے طور پر میں ایک لفظ لیتا ہوں 'مہندی'۔ مہندی کو کچھ لوگ لکھتے ہیں (م ن ہ د ی)۔کچھ لوگ لکھتے ہیں (م ہ ن دی)...لغت میں یہ لفظ دوسری فصل میں آئے گا۔ جب تک آپ یہ طے نہیں کریں گے کہ اس لفظ کا معیاری املا کیا ہے؟ اس وقت تک لغت میں اس لفظ کے اندراج کی صحیح شکل متعین نہیں کی جا سکتی ہے۔اس صورتِ حال نے مجھے متوجہ کیا کہ میں اس موضوع پر کچھ کام کروں۔ چناں چہ میں نے 1960 کے اواخر میں اس موضوع پر باقاعدہ طور پر کام شروع کیا۔مرحوم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس زمانے میں زندہ تھے اور وہ واحد شخص تھے جو املا کے معاملے میں اپنی ساری عمر صرف کر چکے تھے۔ میں نے ان سے ہدایت اور رہنمائی کی درخواست کی تو انھوں نے بڑی خوشی سے ہاں کر دی۔1972 میں مسلسل 12 سال کی کوشش کے بعد میں اپنی کتاب 'اُردو اِملا' کو مرتب کر سکا، جس میں ان ساری چیزوں کو یک جا کر دیا گیا ہے جو اب تک لکھی گئی تھیں۔ان میں بنیاد بنایا گیا ہے انجمن ترقی اُردو کی املا کمیٹی کے اس فیصلے کو جو 1944 میں کیا گیا تھا۔اس کتاب میں، میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور وہ مستند قابل قبول اور معیاری ہے، اسے یک جا کر دیا جائے۔اس میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ املا اور رسم خط دو الگ چیزیں ہیں۔ہماری مشکل یہ ...

(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

جامعہ نگر میں اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی میٹنگ

اردو کے فروغ پر زور

نئی دہلی (27 جولائی)۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے مقصد سے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، صوبۂ دہلی کے زیرِ اہتمام اعظمی میڈیکل سنٹر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی میں ایک اہم میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر تنظیم کے روحِ رواں ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رہے گی۔ ڈاکٹر مفتی جاوید انور نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مساجد میں قرآن کریم کا ترجمہ صرف دیوناگری رسمِ خط میں ہے، حتیٰ کہ بیشتر ہدایات بھی صرف ہندی میں تحریر کی جاتی ہیں جب کہ انھیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہونا چاہیے۔ انھوں نے اس بات پر بھی تشویش ظاہر کی کہ اردو اخبارات گھروں سے تقریباً غائب ہوتے جارہے ہیں۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی نے مولانا اشرف علی تھانوی کے حوالے سے اردو زبان کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ شیخ علیم الدین اسعدی نے دُکانوں کے بورڈ اردو زبان میں لکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ محبانِ اُردو کی ذمے داری ہے کہ دُکانوں کے بورڈ اردو میں بھی تحریر کرائیں۔ اس موقعے پر اعظم گڑھ سے سماجوادی پارٹی کے رکنِ اسمبلی عالم بدیع اعظمی کے انتقال پر تعزیتی قرارداد بھی منظور کی گئی۔ میٹنگ میں اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن وصوبہ دہلی کی نئی مجلسِ عاملہ کا اعلان بھی کیا گیا۔ عرفان احمد اعظمی کو سرپرست، ڈاکٹر مفتی جاوید انور کو صدر، محمد وسیم صدیقی، ماسٹر مقصود احمد اور شہادت علی نظامی کو نائب صدور، اسرار احمد اُجینی کو جنرل سکریٹری، جب کہ ڈاکٹر نجم السحر خاں، محمد اویس گورکھپوری، حکیم حافظ محمد مرتضٰی دہلوی اور محمد شاہد انصاری کو سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ محمد شاہد انصاری میڈیا انچارج، محمد عمران قنوجی خازن اور شیخ علیم الدین اسعدی کنوینر منتخب کیے گئے۔ میٹنگ میں جاوید اختر، اسرار احمد اُجینی، ڈاکٹر نجم السحر خاں، حکیم محمد مرتضٰی دہلوی، محمد وسیم صدیقی، محمد عمران قنوجی، ندیم عارف، وفا اعظمی، گلزار احمد، محمد شاہد انصاری اور محمد اویس گورکھپوری سمیت متعدد افراد نے شرکت کی۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام

’میر تقی میر کی یاد میں‘

شاندار ادبی وموسیقی پروگرام کا انعقاد

نئی دہلی (22 جولائی)۔ اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی کے ملٹی پرپز ہال میں جناب وپن گرگ کے مرتّب کردہ ’دیوانِ میر‘ کے ہندی اڈیشن کی اشاعت کے موقعے پر ’میر تقی میر کی یاد میں‘ کے عنوان سے ایک شاندار ادبی و ثقافتی پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں میر تقی میر کی شخصیت، شاعری اور ادبی وراثت پر ایک فکرانگیز ادبی مذاکرہ منعقد ہوا جب کہ دوسرے سیشن میں میر کی غزلوں پر مشتمل دل نشیں محفلِ غزل پیش کی گئی۔ یہ پروگرام زبان وادب اور ہندستانی تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے حکومتِ دہلی کے وزیر محکمۂ فن، ثقافت والسنہ وچیئرمین اردو اکادمی، دہلی جناب کپل مشرا کی مسلسل سرپرستی اور تعاون کا نتیجہ تھا۔ واضح رہے کہ حکومتِ دہلی اور معزز وزیرِ ثقافت کے مسلسل تعاون کے باعث اردو اکادمی، دہلی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں نہایت اہتمام کے ساتھ تسلسل سے جاری ہیں۔

پروگرام کے آغاز میں دہلی حکومت کے محکمۂ فن، ثقافت اور السنہ کے ایڈیشنل سکریٹری اور اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری جناب لیکھ راج نے معزز مہمانان جناب امت یادو (سابق سکریٹری حکومتِ ہند)، جناب پی کے ترپاٹھی (سابق چیف سکریٹری حکومتِ ہند)، جناب اشوک مہیشوری (مینجنگ ڈائرکٹر راج کمل پرکاشن) اور ممتاز غزل گلوکارہ محترمہ ودیا شاہ کو گلدستے پیش کرکے ان کا خیرمقدم کیا۔ اپنے استقبالیہ خطاب میں جناب لیکھ راج نے تمام شرکا کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ جناب وپن گرگ نے ’دیوانِ میر‘ کو ہندی میں مرتّب کرکے ایک نہایت اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے ذریعے میر تقی میر کی شاعری ہندی قارئین کے ایک وسیع حلقے تک پہنچ سکے گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کام اس لیے بھی بے حد ضروری تھا کہ میر کی شاعری ہر دور میں زندہ رہنے والی شاعری ہے اور تین صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کا کلام اسی تازگی اور تاثیر کے ساتھ پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ پروگرام کا پہلا سیشن ’میر تقی میر: شاعر، ان کی شاعری اور ادبی وراثت‘ کے عنوان سے منعقد ہونے والے ایک علمی وادبی مذاکرے پر مشتمل تھا جس میں معروف صحافی اور داستان گو جناب دارین شاہدی نے دیوانِ میر کے ہندی اڈیشن کے مرتّب و مدیر جناب وپن گرگ سے میر کی شاعری، زبان، ہندی میں دیوان کی ترتیب کی ضرورت اور اس اہم کام کی تکمیل کے دوران پیش آنے والی مشکلات پر تفصیلی اور معلومات افزا گفتگو کی۔ جناب وپن گرگ نے بتایا کہ انھیں بچپن سے ہی شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ جب انھوں نے میر کو پڑھنے کی خواہش کی تو یہ جان کر افسوس ہوا کہ میر کا مکمل کلام ہندی میں دستیاب نہیں ہے۔ چناں چہ انھوں نے اردو اکادمی دہلی کے اردو سرٹیفکیٹ کورس میں داخلہ لیا، اردو سیکھی اور پھر میر کا اصل کلام اردو میں پڑھا، جس کے بعد مذکورہ ’دیوانِ میر‘ مرتّب ہوسکا۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ٹیچرس کی محنت اور طلبہ کی اسکول سے محبت کے نتیجے میں حاضری قابلِ ذکر: حیدر علی ای سی او

بیدر (22 جولائی)۔ جناب حیدر علی سوداگر ای سی او بیدر تعلقہ نے نور خاں تعلیم سرکاری اردو ہائر پرائمری اسکول بیدر میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج کی تقریب یارانِ ادب بیدر کی جانب سے منعقد کی گئی ہے جس کو محمد یوسف رحیم بیدری کئی سال سے چلا رہے ہیں۔ میر بیدری ریاست کرناٹک کے نمایاں شاعر ہیں، جن کی شاعری عنقریب طلبہ کی کتابوں میں خود طلبہ کو پڑھنے کو ملے گی ان شاء اللہ۔ جناب حیدر علی نے مزید کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ طلبہ اسکول آرہے ہیں۔ ایڈن کالونی سے پیدل آرہے ہیں اور پکھال واڑہ سے بھی نور خان تعلیم اسکول کو آرہے ہیں۔ یہ ٹیچرس کی محنت اور طلبہ کی اسکول سے محبت ہے۔ موصوف نے طلبہ سے مختلف سوالات کیے اور کہا کہ طلبہ کو کھیلنا بھی چاہیے۔ اعلا تعلیم حاصل کریں اور اردو زبان کی خدمت بھی کریں۔ انھوں نے صدر مدرس شاد اللہ حسین، نسرین فاطمہ اور عائشہ حمیرا ٹیچر کی تعریف کی۔ جناب عبدالسلیم موظف مدرس نے اپنے خطاب میں بتایا کہ اردو دراصل ہماری مادری زبان ہے۔ اس زبان کو پڑھنے کے تین فائدے ہیں: (۱) مادری زبان ہونے کی وجہ سے اس کا فائدہ ہوتا ہے، (۲) ہم سرکاری اردو اسکول میں کنڑا اور انگریزی بھی پڑھ سکتے ہیں۔ (۳) اردو اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے تین زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔

موصوف نے تقریب کے مہمان سابق صدر SDMC نور خان تعلیم سرکاری اردو اسکول جناب سیّد مختار صاحب کے بارے میں بتایا کہ ان کا احسان ہے کہ انھی کے سبب ہمارے اس اسکول کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ سابقہ عمارت کرایے کی تھی اور ایک موقعے پر اس عمارت کے ٹین ہوا میں اڑ گئے تھے، اللہ کا کرم تھا کہ طلبہ بچے رہے، کسی کو کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

یارانِ ادب کے سکریٹری اور کلیان کرناٹک اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے صدر جناب محمد یوسف رحیم میر بیدری نے نور خاں تعلیم اسکول سے متعلق طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ان کی اپنی تازہ نظم پیش کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ ”آپ تمام بچے اردو، کنڑا، انگریزی کے علاوہ گھر میں عربی اور ہندی پڑھ رہے ہیں۔ ان پانچ پانچ زبانوں کے علاوہ بڑی جماعت کے بچے سوشیل میڈیا پر رومن اردو میں لکھ رہے ہیں۔ اس طرح چھے زبانیں جاننے والے بچے کو ذہین وفطین اور تہذیب یافتہ ہونا ہی چاہیے۔ محترمہ عفیفہ تسکین نے پروگرام کی نظامت کی۔ شکریے پر تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

الخورشید اردو ہائی اسکول کی طالبہ انیبہ انیس شیخ کی نیٹ 2026 میں شاندار کامیابی

دِگرس (22 جولائی)۔ دگرس کے الخورشید اردو ہائی اسکول کی سابق طالبہ انیبہ انیس شیخ نے نیٹ 2026 کے امتحان میں 720 میں سے 588 نمبر حاصل کرکے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی اس شاندار کامیابی پر اسکول، والدین اور پورے علاقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انیبہ کی اس کامیابی پر اسکول میں ایک خصوصی تہنیتی واعزازی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں انیبہ اور ان کے والدین کو مدعو کیا گیا۔ اسکول کے تمام طلبہ کی موجودگی میں انیبہ اور ان کے اہلِ خانہ کی شال اور گلدستہ پیش کرکے عزت افزائی کی گئی۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے جنید سر نے انیبہ کے اسکولی دور کی یادیں تازہ کیں اور ان کی محنت، لگن اور عزم کی ستائش کی۔ اس موقعے پر عتیق شیخ سر نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ’کامیابی کی اصل کنجی مسلسل مطالعہ، خود اعتمادی اور سخت محنت ہے‘۔ انھوں نے طلبہ کو آج ہی سے مقابلہ جاتی امتحانات کی منظّم تیاری شروع کرنے کی تلقین کی۔ انیبہ کے دادا شیخ رحیم نے طلبہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ باقاعدہ مطالعہ، نظم وضبط اور اساتذہ کی رہنمائی کے ذریعے ہر مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اسکول اور اساتذہ کی مخلصانہ خدمات کو سراہا۔ اپنے خطاب میں انیبہ انیس شیخ نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنی کامیابی کا سہرا اپنے اساتذہ، والدین اور اہلِ خانہ کے سر باندھا۔ طلبہ کی رہنمائی کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دسویں جماعت تک سائنس اور ریاضی کے بنیادی تصورات کو مضبوطی سے سمجھیں۔ اگر بنیاد مضبوط ہوگئی تو NEET کا نصاب سمجھنا آسان ہوگا اور کامیابی حاصل کرنا بھی سہل ہوجائے گا۔ انھوں نے اعتماد کے ساتھ کہا کہ اردو میڈیم کے طلبہ بھی درست منصوبہ بندی، مسلسل محنت اور لگن کے ذریعے NEET جیسے قومی سطح کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ اسکول کے صدر مدرس خالد احمد نے انیبہ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کی آئندہ طبی تعلیم اور روشن مستقبل کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اسکول کی خواتین اساتذہ نے گلدستہ پیش کرکے ان کی عزت افزائی کی۔ انیبہ کی اس کامیابی نے اردو میڈیم کے طلبہ میں نیا حوصلہ اور اعتماد پیدا کیا ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ صحیح رہنمائی، مسلسل محنت اور ثابت قدمی کے ذریعے ہر منزل حاصل کی جاسکتی ہے۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

◆◆◆

اردو کے ذریعے نئی نسل کا مستقبل روشن بنانا ہی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا نصب العین

پروفیسر سیّد عین الحسن

نئی دہلی (22 جولائی)۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا نصب العین اردو زبان کو فروغ دینا اور نئی نسل کو روزگار کے قابل بنانا ہے۔اس مقصد کے تحت یونیورسٹی اب تک اردو میڈیم نصاب کی 534 کتابیں تیار کرچکی ہے، جب کہ تقریباً 400 ماہرین اردو میں نصاب کی تیاری میں مصروف ہیں۔ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سیّد عین الحسن نے دہلی ریجنل سنٹر کے نئے دفتر کے افتتاح کے موقعے پر منعقدہ ایک پُر وقار تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی پورے ملک میں اردو میڈیم کے ذریعے اعلا تعلیم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے پیشہ ورانہ کورسز کے ذریعے بڑی تعداد میں نوجوانوں کو روزگار کے قابل بھی بنا رہی ہے۔اس موقعے پر مہمانِ اعزازی، سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے کہا کہ یونیورسٹی نے بالخصوص مدارس کے طلبہ کے لیے پیشہ ورانہ کورسز فراہم کرکے ان کے بہتر مستقبل کی راہ ہموار کی ہے۔قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اردو یونیورسٹی اور این سی پی یو ایل کا قیام تقریباً ایک ہی وقت میں عمل میں آیا، تاہم اردو یونیورسٹی کو ایسے قائدین ملے جن کی صلاحیتوں اور قیادت کی بدولت ادارہ مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر مدھوکر ایم وارے نے بھی اردو یونیورسٹی کی شاندار کارکردگی پر خوشی کا اظہار کیا۔ پروگرام کا آغاز دہلی ریجنل سنٹر کی ریجنل ڈائرکٹر روچیکا کیم کے تعارفی کلمات سے ہوا۔نظامت سیّد جعفر مہدی واسطی اور صادقہ زہرا نے کی جب کہ اظہارِ تشکر کی رسم جاوید عالم نے ادا کی۔ (انقلاب۔دہلی)

اے ایم یو کی تاریخ سے متعلق کتاب کا پروفیسر عرفان حبیب کے ہاتھوں اجرا

علی گڑھ (6 اگست)۔ممتاز مورخ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس پروفیسر عرفان حبیب نے سر سیّد اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران ڈاکٹر شمیم اختر (ڈائرکٹر مرکز برائے تعلیمِ بالغاں) کی تصنیف 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: اے ہسٹری' کا اجرا پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد محسن خاں اور دیگر معزز شخصیات کے ہمراہ کیا۔اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے بھی تقریب میں شرکت کی اور مصنف کو مبارک باد پیش کی۔

اس موقعے پر پروفیسر عرفان حبیب نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام سے متعلق مختلف واقعات بیان کیے اور تقسیمِ ہند کے دور میں یونیورسٹی کی بقا اور تحفظ کے سلسلے میں حکومتِ ہند کی کاوشوں کی بطورِ خاص ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ مختلف پہلوؤں سے لکھی گئی ہے تاہم یہ تصنیف اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں یونیورسٹی کے کردار اور انتظام و انصرام کے پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔انھوں نے کہا کہ جہاں ایک طرف ملک کی تعمیر و ترقی میں اے ایم یو کی گراں قدر خدمات ہیں تو دوسری طرف تقسیمِ ہند کے بعد یونیورسٹی کو بچانے اور اسے فروغ دینے کا کام مرکزی حکومت نے کیا جس کا بطورِ خاص اعتراف کیا جانا چاہیے۔ آنجہانی وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یونیورسٹی کی قومی اہمیت کو محسوس کیا اور وہ یہاں متعدد بار آئے۔انھوں نے کہا کہ یہ تصنیف علی گڑھ کا مطالعہ ہے، جس میں یونیورسٹی کی ترقی کے مختلف مراحل کا جائزہ لیا گیا ہے۔اپنے صدارتی کلمات میں سابق قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر محمد گلریز نے کہا کہ اے ایم یو کے قیام اور اس کی ترقی میں بے شمار افراد نے قربانیاں دی ہیں جس کے سرخیل سر سیّد احمد خاں تھے۔انھوں نے کہا کہ علی گڑھ تحریک کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے ہر محاذ پر پہل کی اور خشتِ اوّل رکھ کر ملک میں جدید تعلیم کی توسیع کا کارنامہ انجام دیا۔اے ایم یو میں 1938 میں ویمنس کالج قائم ہوا جب کہ دہلی میں لڑکیوں کے متعدد معروف کالجز اس کے بعد قائم ہوئے۔

تقریب کے مہمانِ اعزازی پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد محسن خاں نے اپنے خطاب میں کہا کہ علی گڑھ تحریک نے ملک کے علمی و سماجی منظرنامے کو مالا مال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔انھوں نے کہا کہ تاریخ مستقبل کے لیے رہنمائی کرتی ہے اور اے ایم یو کی تاریخ کو ترتیب دے کر ڈاکٹر شمیم اختر نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

شعبۂ تاریخ کے سابق چیئرمین پروفیسر سیّد علی ندیم رضاوی نے کتاب کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تصنیف ایک علمی، آئینی اور تعلیمی ادارے کے طور پر اے ایم یو کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی (ڈائرکٹر سر سیّد اکیڈمی) نے استقبالیہ کلمات ادا کیے۔انھوں نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: اے ہسٹری' یونیورسٹی کے انتظام و انصرام کے پہلوؤں کا خاطر خواہ جائزہ لیتی ہے۔ کتاب میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی محض ایم اے او کالج کی تبدیل شدہ شکل نہیں بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن، ایم اے او کالج اور اے ایم یو فنڈ کمیٹی تین اکائیاں تھیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام میں معاون ہوئیں۔ ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شاہد نے اظہارِ تشکر کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر حسین حیدر نے انجام دیے۔ (روزنامہ تاثیر۔پٹنہ)

پروفیسر محسن عثمانی کی تصنیف 'تراوشِ قلم' پر مذاکرہ

نئی دہلی (26 جولائی)۔انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے مجدد آئی او ایس سنٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر نے نامور ادیب و مصنف پروفیسر محسن عثمانی کے مضامین کی کتاب 'تراوشِ قلم' پر ایک مجلسِ گفتگو کا اہتمام کیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے کی، جب کہ نامور اسکالرز پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر خالد بشیر اور معصوم مرادآبادی نے مذاکرے میں حصہ لیا۔ پروگرام کا آغاز منصور احمد نے قرآنِ پاک کی تلاوت و ترجمے سے کیا، جب کہ کلماتِ خیر مقدمی اور شرکائے مذاکرہ کا تعارف مجدد آئی او ایس سنٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر کے کنوینر انجم نعیم نے پیش کیا۔مصنفِ کتاب پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے کتاب کے مواد پر مختصر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام ان منتشر اوراق کو محفوظ کرنے کی کوشش ہے جو اہم موضوعات پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے اردو نثر میں مصنف کے تعاون کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کے یہ مضامین اہلِ علم و ادب کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے کہا کہ 'تراوشِ قلم' ادبی خوب صورتی اور علمی صداقت کا امتزاج ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کتاب کو معاصر اردو ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔انھوں نے مصنف کے اسلوب کو دلفریب اور پُرخلوص بتایا۔ ڈاکٹر خالد بشیر نے کتاب کی ادبیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ندوی جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں علمی معروضیت اور ادبی ہنرمندی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی باریکیوں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، جب کہ اپنے تاثرات میں معصوم مرادآبادی نے 'تراوشِ قلم' کو اردو کی ادبی اور فکری زندگی کے ایک اہم دور کی دستاویز قرار دیا۔ پروفیسر ندوی نے اس موقعے پر مقررین اور دیگر شرکائے مذاکرہ کے فکر انگیز مشاہدات و تاثرات پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ (انقلاب۔دہلی)

ذاکر حسین دہلی کالج کی نئی عمارت کا افتتاح

نئی دہلی (28 جولائی)۔ ذاکر حسین دہلی کالج کی نئی عمارت کا افتتاح 27 جولائی بروزِ پیر ایک شاندار تقریب کے دوران عمل میں آیا۔ نئی عمارت کا افتتاح کالج کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے لیے خوشی کا موقع ثابت ہوا۔تقریب میں کالج انتظامیہ، اساتذہ، طلبہ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ سنسکرت کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر ارون کمار مشرا کو مدعو کیا گیا تھا جس میں مختلف رسومات ادا کی گئیں۔افتتاحی تقریب کی قیادت ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے کی۔ اس موقعے پر کالج کے چیئرمین پی شرما، ذاکر حسین کالج (شبینہ) کے پرنسپل بھارت سنگھ، مختلف کمیٹیوں کے ذمے داران، تمام شعبہ جات کے سربراہان، اساتذہ اور طلبہ و طالبات بڑی تعداد میں موجود تھے۔کالج انتظامیہ کے مطابق نئی عمارت ادارے کی توسیع اور تعلیمی سرگرمیوں کو مزید موثر بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ قابلِ ذکر ہے کہ اس نئی عمارت کا منصوبہ سابق پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے دورِ سربراہی میں منظور ہوا تھا۔عمارت کی تعمیر کا کام 2017 میں شروع کیا گیا جو طویل عرصے بعد مکمل ہوا اور اب اس کا باقاعدہ افتتاح کر دیا گیا۔ یہ عمارت کالج کی توسیع اور طلبہ و اساتذہ کو بہتر سہولتیں فراہم کرنے کی سمت میں ایک اہم پیش رفت قرار دی جارہی ہے۔ (انقلاب۔دہلی)

امیر خسروؔ پر اہم کتاب کا اُردو ترجمہ شائع

خسرو شناسی میں ایک قابلِ قدر اضافہ

نئی دہلی (6 اگست)۔اردو ادب اور خسرو شناسی کے حلقوں کے لیے یہ ایک خوش آئند خبر ہے کہ معروف ہندی ادیب پردیپ شرما خسروؔ کی تصنیف 'امیر خسرو: ایک ہمہ جہت شخصیت' کا شاندار اردو ترجمہ ڈاکٹر شبیر عالم (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو مرزا غالب کالج، گیا) نے انجام دیا ہے۔اس اہم علمی و ادبی کاوش کو ملک کے ممتاز اشاعتی ادارے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

یہ کتاب عظیم صوفی شاعر، مفکر، موسیقار اور ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ کردار امیر خسروؔ کی حیات، شخصیت، خدمات اور ہمہ گیر کارناموں پر مبنی ایک مستند تصنیف ہے۔ ڈاکٹر شبیر عالم نے نہایت سلیس، شستہ اور رواں اردو میں اس کا ترجمہ کرکے اردو قارئین کے لیے خسرو شناسی کا ایک نیا باب وا کیا ہے، جس سے نہ صرف اردو ادب کے طلبہ و اساتذہ بلکہ عام قارئین بھی بھرپور استفادہ کرسکیں گے۔ ڈاکٹر شبیر عالم تدریسی میدان میں طویل تجربے کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری کے شعبے میں بھی ایک معتبر نام ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں 'انجم مانپوری بحیثیت مزاح نگار' اور 'ہندستانی اساطیر' بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ان کی علمی و تحقیقی خدمات کو ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زمانۂ طالبِ علمی ہی سے ڈاکٹر شبیر عالم علمی، ادبی اور سماجی سرگرمیوں میں نہایت متحرک اور فعال رہے ہیں۔انھوں نے کئی ماہ تک آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر، تجزیہ نگار اور پروڈیوسر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں، جس سے ان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ماہرینِ ادب کا ماننا ہے کہ پردیپ شرما خسرو کی اس اہم ہندی تصنیف کا اردو ترجمہ نہ صرف دونوں زبانوں کے ادبی روابط کو مزید مستحکم کرے گا بلکہ امیر خسرو کے افکار و فن کو اردو دنیا میں نئے انداز سے متعارف کرانے میں بھی سنگِ میل ثابت ہوگا۔

(روزنامہ تاثیر۔پٹنہ)

مسائلِ لغت و قواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

ہے کہ ہم چیزوں کو گڈمڈ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم رسمِ خط میں اصلاح چاہتے ہیں۔ حالاں کہ رسمِ خط میں اصلاح نہیں ہوتی... اصلاح ہوتی ہے املا میں۔ رسم خط نام ہے روش کا... املا نام ہے لفظوں میں حرف کے تعین کا اور اس کے لکھنے کے طریقے کا۔ غرض اس سات سو صفحات کی کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس میں سارے مسائل یک جا ہو جائیں۔ مجھے مسرت ہے کہ اس زمانے میں جب کہ زبان اور قواعد کی طرف توجہ کم ہے۔ اس کتاب کے بڑے اثرات ظاہر ہوں گے علاوہ اور اثرات کے... ہمارے یہاں جب کوئی شخص لکھنے بیٹھتا ہے تو اس وقت وہ سوچتا ہے کہ میں کیسے لکھوں۔ یہ خیال اس سے پہلے نہیں آتا یعنی املا نے ہمارے یہاں موضوع کی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کو یہ اہمیت حاصل ہو جائے اور آدمی جب لکھنے بیٹھے تو اس کے ذہن میں ہو کہ اس لفظ کو کیسے لکھنا ہے۔"[۴۸]

رشید حسن خاں نے اطہر فاروقی کو دیے انٹرویو میں ترقی اُردو بورڈ کراچی کے لغت کے بارے میں بتایا کہ پاکستان میں 53-1952 میں ایک ضخیم لغت کا منصوبہ بنایا گیا، لیکن کئی برس کی محنت کے بعد جب اس لغت کی پہلی جلد منظرِ عام پر آئی تو اسے لغت کے بجائے پشتارۂ اغلاط کہنا مناسب ہوگا۔ رشید صاحب کے مطابق جب اس لغت کی پہلی جلد پر ان کا تبصرہ شائع ہوا تو ادارے کے سربراہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو اپنی ملازمت سے رخصت ہونا پڑا۔ مشفق خواجہ کے نام 14 جولائی 1978 کو لکھے خط میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا کہ ترقی اُردو بورڈ کے لغت کو ابواللیث صاحب چوپٹ کر دیں گے۔ انھوں نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ ازل سے اب تک ایسا گھٹیا اور جاہلانہ کام اور کوئی نہیں ہوا[۴۹]۔ اطہر فاروقی کو دیے انٹرویو کا وہ حصہ ملاحظہ کیجیے جس میں ترقی اُردو بورڈ کراچی کے لغت کی پہلی جلد پر رشید صاحب کے تبصرے اور ابواللیث صدیقی صاحب اور ہندستان میں تیار ہونے والے لغات کی صورتِ حال کا خصوصی ذکر موجود ہے:

"پاکستان میں بہت پہلے 1952-1953 کے قریب بہت بڑا منصوبہ تیار کیا گیا تھا کہ چودہ جلدوں میں اُردو کا مکمل لغت مرتب کیا جائے گا۔ اس کے لیے ضروری رقم فراخ دلی کے ساتھ مختص کی گئی، ضروری عملہ رکھا گیا۔ جب اس لغت کی پہلی جلد چھپ کر آئی اور میں نے اس جلد کو دیکھا تو میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میں کیا کہوں۔ اُردو میں لکھی گئی غلط سے غلط کتاب کو سامنے رکھ لیجیے تو غلطیوں میں اس لغت کا مقابلہ وہ کتاب نہیں کر سکے گی۔ عالم یہ ہے کہ اس لغت کے اندراج کو آپ اس اعتماد سے پیش ہی نہیں کر سکتے کہ وہ صحیح ہے، جو حوالے دیے گئے ہیں ان میں سے بیش تر غلط ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ مرتبِ لغت نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں خود ہی یہ بات لکھی ہے اس لغت کے بنیادی کارڈ جن لوگوں نے بنائے وہ اس قدر کم سواد تھے کہ لفظوں کو صحیح طور پر پڑھ ہی نہیں سکتے تھے، لیکن اس کمی کا اندازہ اس وقت ہوا جب یہ لغت چھپنے جا رہا تھا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ لاکھوں روپے صرف کرنے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے، اس میں بہت سے آدمی رکھے جاتے ہیں، لیکن اس کے بنیادی کارڈ جو اصل کام ہے وہ لوگ بناتے ہیں جو کم سواد ہیں۔ میں نے اس لغت پر مفصل تبصرہ لکھا تھا جو شائع ہوا اور بہت مقبول بھی ہوا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس لغت کے جو مرتبِ اعلا تھے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ان غریب کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا، اس کا مجھے افسوس ہوا، لیکن یہ تو الگ بات ہے۔ کیا یہ چیز بہت زیادہ پریشان کن نہیں ہے کہ ہندستان میں ترقی اُردو بیورو کا لغت لمبے عرصے اور بہت سے خرچ کے باوجود مکمل نہیں ہو سکا۔ پہلی جلد کیا، پہلے دس صفحے بھی مکمل نہیں ہوئے اور پاکستان میں جو لغت مرتب ہوا، تو وہ بھی مجموعۂ اغلاط ثابت ہوا۔ ان سب باتوں سے اندازہ یہی تو ہوتا ہے کہ ہندستان ہو یا پاکستان اُردو کے اربابِ نظر اور اربابِ قلم علمی کاموں کے بجائے غیر علمی کاموں میں اس قدر مصروف ہو چکے ہیں بلکہ گلے گلے پھنس چکے ہیں کہ علمی کاموں کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں رہا ہے۔"[۵۰]

رشید صاحب نے اپنے انٹرویوز میں اس جانب بھی واضح اشارے کیے کہ ہر مُلک اور علاقے کے لوگ اپنی سہولت کے حساب سے زبان کے تلفظ میں تبدیلی کر لیتے ہیں، لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ املے میں تبدیلی کرنا سراسر زیادتی کے مترادف ہے۔ انھوں نے لغت نویسوں سے گزارش کی کہ وہ لفظ کو اس کے تلفظ کے اعتبار سے لغت میں اندراج کریں تو یہ کوئی مجرمانہ عمل نہیں ہے۔ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کو دیے انٹرویو میں انکشاف کیا کہ ان کے ادبی سفر کا آغاز لغت، قواعد اور علم عروض پر مضامین لکھ کر ہوا۔ یعنی رشید صاحب 1948 تا 1958 تک لغت، زبان اور عروض کی بحثوں میں منہمک رہے:

"میرا سفر شروع ہوا لغت سے، قواعد سے اور علم عروض سے۔ میرے پہلے جو مضامین ہیں، جو میرے طویل مضامین ہیں وہ میں نے لغت پر لکھے ہیں، تلفظ پر لکھے ہیں، قواعد پر لکھے ہیں، عروض پر لکھے ہیں۔ یوں سمجھیے 48 سے 58 تک، دس گیارہ سال میں اس زبان کی بحثوں میں اُلجھا رہا تو گویا ابتدائی شکل جو بنی تھی کہ اس لفظ کا تلفظ یوں ہے تو کیوں ہے؟"[۵۱]

رشید حسن خاں ہمیشہ اس بات پر نالاں رہے کہ ہمارے یہاں (ہندو پاک) میں اجتماعی کام کی جگہ انفرادی کام کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بالخصوص لغات کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ جب حکومت یا کوئی ادارہ کسی لغت کے پروجیکٹ کا منصوبہ تیار کرتا ہے تو اس میں ذمے داری بھی طے ہونا چاہیے۔ رشید صاحب چاہتے تھے کہ اُردو کی کوئی ایسی مرکزی لائبریری بنائی جائے جہاں اس کا تمام سرمایہ موجود ہو۔ انھوں نے لغت نویسوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ لغت میں ایسے الفاظ شامل نہیں کرنے چاہئیں جن سے عوام نامانوس ہوں۔ اس بارے میں انھوں نے 'مہذب اللغات' کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس لغت میں سنسکرت کے بہت سے ایسے الفاظ شامل کر دیے گئے جن سے اُردو والے تو کیا ہندی والے بھی واقف نہیں۔ حسن رضوی کے سوال کے جواب کا اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں مذکورہ بالا باتوں کو پیش کیا گیا ہے:

"ہمارے ہاں ایک لغت لکھا گیا ہے مہذب اللغات۔ اس میں سنسکرت کے سیکڑوں الفاظ ایسے شامل کر دیے گئے ہیں جن سے اُردو والے کیا ہندی والے آشنا نہیں۔ ترقی اُردو بورڈ والوں نے یہ غضب کیا کہ اس لغت سے سارے کارڈ نقل کر لیے۔ سند نہ اِن کے پاس تھی نہ اُن کے پاس... اب وہ سب لفظ اُردو کے حصے میں آ گئے جن سے ہندی والے واقف نہیں۔ مرتب اعلا نے اس لغت کے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ بنیادی کارڈ جن لوگوں نے بنائے وہ اس قدر کم سواد تھے کہ صحیح عبارت نقل نہیں کر سکے۔ یہ ان کے الفاظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ان کے اپنے بقول صحیح نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اُردو کی کوئی ایسی مرکزی لائبریری نہیں جس میں اُردو کی ساری کتابیں ملتی ہوں۔ ہمارا بہت بڑا ذخیرہ لندن، جرمنی اور دوسرے ممالک میں ہے، یہ ہندستان کی لائبریریوں میں جمع ہونا چاہیے تاکہ صحیح تحقیق کے دروازے کھل سکیں اور معتبر اور غیر معتبر اڈیشنوں میں تمیز کی جا سکے۔"[۵۲]

اب ہم رشید حسن خاں کے اُن مضامین کی جانب رُخ کرتے ہیں جو انھوں نے مسائلِ لُغت و قواعد کے تعلق سے تحریر کیے ہیں۔ ان کے یہ مضامین ہندو پاک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ خاں صاحب کے زبان، بیان، لغت، املا اور عروض وغیرہ موضوعات پر مضامین کے شائع ہونے کے بعد بعض اہلِ قلم بالخصوص حفیظ الرحمٰن واصف، فراق گورکھپوری، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، ڈاکٹر ابومحمد سحر وغیرہ نے تحریری اختلاف کیا۔ ان اختلافی تحریروں سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوا۔

رشید حسن خاں کا مضمون 'اربابِ لغات کے لطیفے' ماہ نامہ شاعر بابت جون 1952 میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی کئی قسطیں اسی رسالے میں پہلے بھی شائع ہو چکی تھیں۔ موصوف نے اپنے مضمون میں غیاث اللغات، بہارِ عجم، ازاحۃ الاغلاط، فرہنگِ عامرہ وغیرہ میں شامل الفاظ کے معانی و مطالب پر طویل بحث کی ہے۔ دراصل موصوف نے مضمون میں لفظوں کی اصل ساخت اور ان کے استعمال کے طریقِ کار پر مباحثہ کیا ہے۔ رشید صاحب نے غیاث اللغات میں شامل دوسری کتابوں کے حوالوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے لکھا کہ یہ ناقابلِ اعتبار کتاب ہے۔ مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"غیاث اللغات میں متعدد مقامات پر دوسری کتابوں کے غلط حوالے درج ہیں۔ کہیں کہیں مصنف نے کسی لفظ کے متعلق کسی لُغت کی کتاب کا حوالہ دے کر اس کی صرف ایک حرکت نقل کر دی ہے حالاں کہ اس کتاب میں اس کی دو مختلف حرکات درج ہیں جس سے بعض وقت بڑا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے غیاث سخت ناقابلِ اعتبار کتاب ہے، اور ضروری ہے کہ اس کے حوالوں کی جب تک تطبیق نہ کر لی جائے اُس وقت تک انھیں ادا نہ کیا جائے۔ اس مضمون کی پہلی قسط میں متعدد لفظ ایسے لکھ چکا ہوں اس قسط میں پہلے سے دو گنے الفاظ موجود ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو شاید بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کے مآخذ میں خلط مبحث ہو۔"[۵۳]

حواشی:

۴۴ مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام، مرتبہ راقم الحروف، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2024، ص 422

۴۵ رشید حسن خاں کے خطوط (جلد چہارم) مرتبہ ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، اپریل 2026، ص 396-395

۴۶ مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام، مرتبہ راقم الحروف، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2024، ص 434

۴۷ رشید حسن خاں کے انٹرویوز (اضافہ شدہ اڈیشن)، مرتبہ راقم الحروف، 2025، ص 99 ۴۸ ایضاً، ص 115

۴۹ رشید حسن خاں کے خطوط (جلد چہارم)، مرتبہ ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، اپریل 2026، ص 332

۵۰ رشید حسن خاں کے انٹرویوز (اضافہ شدہ اڈیشن)، مرتبہ راقم الحروف، 2025، ص 158-157

۵۱ ایضاً، ص 242 ۵۲ ایضاً، 268

۵۳ رسالہ شاعر، بمبئی، جلد 23، شمارہ 6، جون 1952، ص 13

(باقی آئندہ)

جونؔ ایلیا کی شاعری کی زیریں لہریں

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

ہے جون قافلہ و راحلہ میں شور بپا
یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے وہاں تو کچھ بھی نہیں

جونؔ راست گفتگو کو اہمیت دیتے ہیں اور ترسیل کو مقصدِ سخن مانتے ہیں، اس لیے تشبیہ سے استعارہ اور علامت کی جانب رجوع نہیں کرتے، لیکن بار بار استعجابی اور استفہامی لب ولہجہ کو ترسیل کے آلے کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ موضوعات ان کی ذات کی شفافیت، سوچ میں اٹھتے ہوئے سوالات اور ان کے نامطمئن جوابات، اختلافات، ردوکد اور اس نوع کے مضامین سے مملو ہیں، وہ اپنی شاعری میں ایک ایسے فرد کی طرح ابھرتے ہیں جو اختلاف کو اولیت دیتا ہے۔ منافقت اور سیاست کو زندگی کے لیے زہر سمجھتا ہے۔

جون ایلیا کی شاعری کے موضوعات میں شکوہِ غمِ دوراں، تہی دامنی، ہجرت کے نقائص، بے سبب میخواری کی توجیہ، یادوں کی نوحہ گری اور سماجی اصولوں سے بغاوت نمایاں ہیں۔ مروجہ اقدار پر ان کا ایقان یوں کم زور ہو گیا تھا کہ ان کی نگاہ میں کئی اقداری شخصیات اور اقداری محکمات علامتی نشانات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے، وہ ان تمام اقدار سے جو خدا، قدرت، قسمت، نیکی، خیر وشر کا تصادم، امن وامان وغیرہ کا بار بار ذکر کرتی ہیں شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور بلند آواز میں سوالات اٹھاتے رہے۔ ان کا اعتماد بری طرح پاش پاش ہو چکا تھا۔ وہ صاف ستھرا رہنے کے احکامات میں بھی تحکمانہ درشتی پاتے۔

جون کی شاعری میں تندخوئی بہت ہے اور ان کے بیشتر پیکر حسیاتی ہیں اور پیکر مناظر سے منتخبہ افعال کے تفاعل سے ایک خاص نشست میں ایک زاویے پر واضح ہوتے ہیں۔ جون کا لب ولہجہ مکالماتی ہے اور یہ مکالماتی لہجہ غالباً ان کے تحت الشعور میں انقلابیت اور بغاوت پسندی کے احساس کی دلیل ہے۔ شاعر کسی نہ کسی طور پر سماجی اور معاشی بہتری کے حل کا خواہاں ہے۔ اس کی شعری فکر اس بات کی قائل ہے کہ ذات ایک منتشر معاشرے کی اکائی ہے (ایسی اکائی جس کے رشتے جبلی اور مصلحت کوش ہیں) صدا وشور، حرکت و رفتار سے بھرے بلکہ روندے ہوئے اس معاشرے میں واضح تعلقات کی جگہ علامتی اور اشارتی نسبتوں نے لے لی ہے۔

میری نگاہ میں جون کے وہ اشعار جو جنسی بدلذتی، خود تلذذ، اخلاقی بدفکری اور بدفعلیوں اور عضو (بلکہ ناف) پرستی کے خیالات کو کھلے عام اظہار واعلان کے عکاس ہیں، نامناسب ہیں اور ان کی شاعری کو ایک حد تک کجلاتے ہیں۔ مثال طور پر:

اتھلا سا ناف پیالہ ہماری نہیں تلاش
اے لڑکیو! بتاؤ بھنور کس کے پاس ہے؟

یہ میرا جوشِ محبت فقط عبارت ہے
تمھاری چمپئی رانوں کو نوچ کھانے سے

ایک آفت ہے وہ پیالۂ ناف
کیا قیامت ہے وہ پیالۂ ناف

ہائے تیری چھاتیوں کا تن تناؤ
پھر تری مجبوریاں، ناچاریاں

یہ اشعار اگرچہ جون نے اظہارِ ذات اور جدت کی تلاش میں تحریر کیے تھے لیکن اس کلام میں فحش لب ولہجہ اور عریاں بیانی اردو تہذیب و ادب کے مزاج میں ہمیشہ انمل اور بے جوڑ ہی مانی جائے گی۔ بنیادی سوال اس قسم کی ارادی ناشائستگی کے شوق کے بارے میں ہمیشہ رہے گا۔ جون نے اسی طرح اپنی میخواری کا کئی اشعار میں شور واعلان کیا ہے۔ جون کی سوچ میں ایک بکھراؤ ہے اور بکھراؤ بھی ایک خاص کیفیت کی توضیح ہے۔ ایک طرف وہ روایت کی شکست کو اس بنا پر لازم سمجھتے ہیں کہ روایت نے اعتقاد اور مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے تو دوسری طرف روایات کے نوحہ گر بھی ہیں کہ ان کی کمی نے انسانی بھیڑ کو بے سمت کر دیا ہے۔ ان کی شاعری چوں کہ کسی قسم کی عملی اور تحریکی عصبیت نہیں رکھتی، اس لیے اس کا لہجہ طنز کی صورت درشت ہو کر بھی عشق میں لطیف ہو جاتا ہے۔ طنزیہ درشتی کے لیے نیا شاعر آئینے سے باتیں کرتا ہے۔ بار بار وہ اپنے مخاطب سے تکلم کرتا ہے اور یہ مخاطب اگر آپ یہ غور سے پڑھیں تو شاعر خود ہے جو اپنے آپ کو اپنے تجربات ومفروضات کی دھار پر پرکھتا ہے اور اس کے طنز کی گرمی تیکھی اور زہریلی ہو جاتی ہے۔ یہ لب ولہجہ جون ایلیا کے لب و لہجے سے ملتا جلتا ہے۔

جون نے جس طرح زبان و بیان کو بہتر اور صحیح رکھنے پر محنت کی، اسی طرح زندگی کے مشاہدات کو ہلکے سے موڑ دے کر نامحسوس طور پر تخلیق آفرینی کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام سامعین و قارئین کے کسی نہ کسی حلقے کو اپنے پرتوِ اظہار سے قریب لگا اور اس طرح اردو دنیا میں قبولیت کا مقام ان کو ملا۔ جون ایلیا کے بہت سے اشعار قابل ذکر وداد ہیں۔ چند مثال کے طور پر پیش ہیں:

ساری گلی ویران پڑی تھی، بادِ فنا کے پردے میں
ہجر کے دالان اور آنگن میں بس اک سایہ زندہ تھا

وہ وار کر گیا ہے، پہلو سے کون مجھ پر
تھا میں ہی دائیں بائیں اور میں ہی درمیاں تھا

اک عجب آمد وشد ہے کہ نہ ماضی ہے نہ حال
جون برپا کئی نسلوں کا سفر ہے مجھ میں

کیسے پہنچے غنیم تک یہ خبر
گھر گیا ہوں میں اپنے جنگل میں

اس گلی نے یہ کہہ کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

جون ایلیا نے درد کی اذیت کو اپنی سوچ کے تجرباتی اسلوب سے شدید تر کر کے برداشت کے کرب کو سخن سے ناطق کیا، جذبے کی وارفتگی کو احتیاط کی پابندیوں سے باہر لا کر اسالیبِ اظہار سے ٹکرا کر مختلف رنگوں اور اظہار کی صورتوں کے ذریعے تخلیقات میں آراستہ کر دیا۔ میانہ روی کو قطعاً نہیں اپنایا، اس لیے ان کی شاعری میں ان کی مخصوص کردہ ترتیب کا اثر نظر آتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اردو کی جدید شاعری کے اہم ناموں میں جون ایلیا کا نام ضرور ایک تابندہ ستارہ کی طرح پہچانا جا رہا ہے۔

12-2-823/C/47، ایس بی آئی کالونی، مہدی پٹنم،
حیدرآباد–500028 (تلنگانہ)
E-mail: aslamimadi@yahoo.com,
Cell Phone: 9966683014

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اہم کتاب

آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ

بشیر بدر

- بشیر بدر برِصغیرِ ہندو پاک ہی نہیں، عالمی سطح پر مشاعروں کی دنیا کی ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شاعری نے مشاعروں میں شرکت کرنے والے ان کے ساتھی شعرا کے ساتھ مشاعروں کی بنیادوں کو بھی زیر وزبر کر دیا تھا۔ وہ تقریباً نصف صدی تک اردو غزل کے بانکپن سے سرشار گیسوے غزل کو سنوارتے رہے۔ بلاشبہ ان کا عہد مشاعروں کا ایک زرّیں عہد رہا ہے۔ بشیر بدر نے نثر میں بھی اپنی تحقیقی وتنقیدی عظمتوں کے اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کا تحقیقی مقالہ ’آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ‘ ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلے 1981 میں طبع ہوئی تھی، اس کا دوسرا اڈیشن 2023 میں نہایت خوب صورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔
- انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ہر عہد کی ایسی ہی شخصیتوں کی نادر تحقیقی وتنقیدی تحریروں کو اردو ادب کے عام قاری تک اپنے نفیس اور پُرکشش انداز میں پہنچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہی ہے۔ بشیر بدر کی کتاب ’آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ‘ اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم اور مفید کتاب ہے جس کی ایک دستاویزی حیثیت ہو گئی ہے۔
- بشیر بدر کی یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ ساتھ منفرد موضوعات کا مطالعہ کرنے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے عام قاری کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے۔

ضخامت: 343 صفحات —— قیمت: 500 روپے

جونؔ ایلیا کی شاعری کی زیریں لہریں

اسلم عمادی

اردو کی وہ دلکش و دلنواز شاعری جو جون ایلیا (پ: 14 ستمبر 1931- م: 8 نومبر 2002) سے منسوب ہے، عجب سی کشش رکھتی ہے۔ سادہ لہجہ اور عجب انداز سے مملو شاعری جسے جون نے اپنے نٹ کھٹ اور کھلنڈرے انداز میں جب پیش کیا تو یکا یک شعری محفلوں اور مشاعروں کی جان بن گئے۔ ان کا جداگانہ ڈکشن اور سادہ لیکن موڑ لیتی، بل کھاتی، چونکا دینے والے زاویوں سے آراستہ شاعری بہت جلد عوام وخواص کے دلوں میں اپنے نقوش نمایاں کرنے لگی۔ جون ایلیا مشاعروں میں عوام کی توجہ کے لیے پڑھنے کے انداز میں میخواروں جیسی بوالعجبی اختیار کر لیتے تھے۔ اپنے ذاتی عقائد کی بنیادوں پر آزاد خیالی سے متاثر (بلکہ انکار کی جانب مائل) جملہ بازی، کبھی عریانی کی طرف جھکاؤ، کبھی بے حد معنی خیز سہل ممتنع شعری رویہ جون کی شاعری کو دوسرے شاعروں سے مختلف مقام پر عطا کرتا ہے۔

جون ایلیا اپنی شاعری میں واحد متکلم کا روپ دھار لیتے ہیں اور اپنے مخاطب سے اپنے زعم میں پتے کی باتیں کرتے، اعتقاد کو متزلزل کرنے والے سوالات کرتے ہیں اور ایک دانشور کی طرح ارشادات سے نوازتے بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ دلیل، رد دلیل اور جوابِ دلیل، شعری تجسیم، اقوال اور نکتہ دانی، اضداد و اختلاف، بحث و کج بحثی کے پہلو ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو حصول علم، مختلف انواع و عقائد، براہین ونظریات کے مطالعے، جائزے اور تحقیق کا ان کو خاطر خواہ شوق تھا، وہ ہر زاویے کو ہم عصر صورتِ حال اور اپنے بنیادی سوچ کے تناظر میں پرکھ کر اپنے کلام کے ذریعے اپنے مخاطب سامع اور قاری تک پہنچاتے تھے۔

1947 کے بعد آزادی اور ہند و پاک تقسیم کے ماحول میں پروردہ اردو ادب وشعر کے افق پر جو نمائندہ نام ابھرے اُن میں جون کا نام بھی عیاں تھا۔ جون کی اولین تعلیم، شاعری اور ملازمت کی ابتدا ان کے آبائی وطن امروہہ میں ہوئی۔ ایک بے حد مذہبی، شیعہ دینی تعلیم سے مالا مال، ثقہ اور ادبی ماحول میں جون ایلیا نے آنکھ کھولی۔ وہ امروہہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی تخلیقات اور مشاغل کی بنا پر وہ پاکستان اور ہندستان کے اردو ماحول میں معروف ہو گئے تھے۔ جون ان ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں میں سے تھے جو تقسیم ہند کے تحت پاکستان چلے تو گئے، لیکن ان کا روحانی تعلق ان کے آبائی وطن سے ہمیشہ قائم رہا۔ ایک عجیب سی بے اطمینانی تھی جو ان کے مزاج میں آ گئی تھی، وہ ذہنی طور سے امروہہ کی یادوں اور محبتوں کے حصار میں رہے۔

انقلاب کے ترانوں کے ماحول میں شروع ہونے والی ان کی شاعری، مختلف نظریاتی لہروں اور رویوں سے گزرتی رہی، ان کے کلام میں ترقی پسندی، جدیدیت اور تجربوں کے عکس ان کی شاعری کے مختلف ادوار میں پائے جاسکتے ہیں۔ جون کی شاعری پر تبصرہ بلا شبہ ان کے متضاد اور منحرف عقائد، تصورات، چونکانے والی جملہ بازی، فحش نگاری کی جانب جھکاؤ، افکار وضوابط سے ٹکراؤ جیسے خیالات سے پہلو تہی نہیں کرسکتا۔ ان کی شاعری میں ان کی بے ترتیب زندگی اور فکری انتشار بین السطور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

نشر واشاعت وطباعت کے شعبوں اور کاروبار سے طویل عرصے تک متعلق ہونے کے سبب جون نے بہت سے مضامین شائع کیے اور کتابیں طبع کرائیں، ان کی زود گوئی بھی قابل ذکر ہے، ہر صنفِ شعر ونثر میں انھوں نے کامیاب طبع آزمائی کی، انھوں نے فلسفہ، مذہبیات، ہجرت کے مسائل، سیاسیات، اشتراکیت اور اسلامی فکر، انواعِ مذاہب وعقائد، اور مشرق وسطی کی تاریخ اور بعض دوسرے موضوعات پر لکھا اور اپنے مخصوص، راست وغیر راست اسلوبِ تحریر میں کتابیں شائع کیں۔

مشاعروں میں بدمست انداز میں توجہ طلبی، نعرہ زنی، سہل ممتنع اشعار میں زاویہ بدل بدل کے معنی کے پرتو عیاں کرنے کے انداز نے ان کے لیے ایک خاص حلقۂ شائقین بنا دیا تھا۔ یہ شہرت بے شبہ ان کے کلام کی دل پذیری اور ان کی ہر اصول وعقیدہ کو چیلنج کرنے کی صفت کی وجہ سے بھی تھی۔ انھوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں: غزل، نظم، ڈراما، مسدس، قطعہ، قصیدہ، اور بہت کچھ۔ جون ایلیا کی زبان شستہ، بے عیب وخطا اور معیاری اردو ہے، اس میں بہت ساری ترکیبوں، لفظیات کی نشست و برخاست اور سلاست کے ساتھ شعر میں داخل کرنے کا عمل ان کی لغت دانی اور زبان کی روح سے مناسبت ثابت ہوتی ہے۔ انھوں نے ادب اور حکمت کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، جو ان کی سوچ کے تار و پود میں رچ بس کر بالکل نئے پیراہن میں شعر کی تخلیق میں ممد ومعاون ہوا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ایک دوست دار، خوش مزاج اور انسانیت پرست فرد کی طرح ابھرتے ہیں۔

جون کے اشعار وجودِ خدا کے بارے ان منتشر فکر کی اہم مثال ہیں جن میں دہریت اور منکریت سے مماثلت جھلکتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے کبھی ان تصورات سے شاعرانہ رجوع کیا بھی ہے پھر بھی ایسے خیالات شائع کرانے اور مستقل کلام میں چھپوانے سے ان کی غیر مذہبی حلقوں میں شہرت پسندی کی کوشش کا جذبہ نمایاں لگتا ہے۔ اب ذرا ان کے ذیل کے اشعار پڑھ کر سوچیں:

ہے خدا پر ہی منحصر ہر بات
اور آفت یہ ہے، خدا ہی نہیں

اتنا خالی تھا اندرون مرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا ؟

جون کے چاہنے والے نبھانے کے لیے منطق اور فلسفہ کے کیسے ہی سہارے لیں، یہ بات واضح ہے کہ جون نے بہ بانگ دہل ایسی منکرانہ سوچ کے دعوے کیے۔ جون ابتدائی کلام میں اشتراکی نظریات اور کمیونزم سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پھر یکا یک وہ ناراض، غیر مطمئن، بے چین و مضطرب شاعر کی طرح ملتے ہیں جو سب سے برگشتہ، خود پرست یکہ وتنہا اور الگ تھلگ فرد ہو۔ اس صورتِ حال کا ایک عجیب سا غیر عمومی پہلو ان کے اشعار میں کچھ یوں نظر آتا ہے:

وہ کارگاہ ہوں جو عجب نا درست ہے
جو کچھ یہاں درست ہے، وہ بے درست ہے

اب مری کوئی زندگی ہی نہیں
اب بھی تم میری زندگی ہو کیا؟

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

تصانیف (شعری کتب):

- گمان • گویا • لیکن • رموز • مبادا • شاید
- زخم امید • یعنی • کلیات • تمھارے اور میرے درمیان
- قطعات • دریچہ ہائے خیال

نثری کتب و تراجم:

- مسیح بغداد: حلاج • اسماعیلیت شام وعراق میں
- اسماعیلیت یمن میں • تہذیب • رہائش وکشائش
- فرنود • مسائلِ تجرید • تجرید • عدد • کتاب الطّواسین
- کتاب الحلاج • جوہرِ صقلی • حسن بن صباح

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران : منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722